تحریر: پروفیسر مولانا محمد علم الدین سالک
ترتیب: پروفیسر احسان الٰہی سالک

اقبال ــــ آزادیٔ ملّت کا ہیرو

علامہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ کو سیالکوٹ کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔ ان کی گوت "سپرو" تھی۔ مگر اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نے ایک خدارسیدہ شیخِ طریقت کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی تھی۔ یہ اس شیخ کا روحانی تصرّف یا اسلام کا فیضان تھا کہ اس خاندان نے ہمیشہ اسلامی روایات کو زندہ رکھا۔ علامہ مرحوم کو اس بات پر فخر تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

سیالکوٹ ان ایام میں ایک اچھا خاصا تعلیمی مرکز تھا۔ علامہ اقبال کی تعلیم کا آغاز بھی یہاں سے ہوا اور وہاں سے ایف۔ اے پاس کر کے لاہور چلے آئے۔ جہاں ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم۔ اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔

جن ایام میں علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، لاہور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ علمی و ادبی ہنگاموں کے ساتھ ساتھ مذہبی، معاشرتی اور کسی حد تک نیم سیاسی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ اس وقت ملک میں بظاہر کسی قسم کا ہیجان نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی ناکام ہو چکی تھی۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں شریک کی حیثیت سے حصہ لیا۔ وہ دوش بدوش کھڑے ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑے مگر جب انگریز کو فتح حاصل ہوئی تو ہندو نے چپ چاپ اس سے صلح کر لی اور اس کا ہم کار ہو کر مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تل گیا۔ انگریز نے بھی یہی بہتر خیال کیا کہ اکثریت کو ساتھ ملاؤ اور اقلیت کی پروا نہ کرو۔ علاوہ ویسے بھی برطانیہ کو تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے زیادہ شوریدہ سر اور انقلاب پرور ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہندوؤں کی ہر قسم کی زیادتیاں فراموش کر کے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

ہندو موقع شناس تھا، وہ اس کا ہوگیا اور دونوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔

مسلمانوں کو جنگِ آزادی میں شکست کھانے کا رنج اور ہندوؤں نے جو روش اختیار کی تھی، اس پر غصہ تھا۔ ان حالات میں بھی وہ اپنی غیرت و حمیت سے ہاتھ اٹھانا پسند نہ کرتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر انگریز سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔ یہی وہ متاعِ عزیز تھی جسے وہ زندگی کا سہارا سمجھتا تھا۔ وہ ہر طرح کی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اقتصادی بدحالی کا شکار، افلاس و غربت کا مارا ہوا تھا، ترقی کی دوڑ میں اپنے ہمسایہ سے بہت پیچھے تھا، مگر پھر بھی وہ خوش تھا۔ اسے سکون و طمانیت کی دولت حاصل تھی، اس کے لب شکوہ سنجی سے ناآشنا تھے۔ اس کی زندگی میں ایک خاص تمکنت و وقار کی جھلک نمایاں تھی۔ تاآنکہ بعض حساس مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کا نسخۂ کیمیا آزمانا شروع کیا۔ مگر اس کے لیے پرہیز یہ تجویز ہوا کہ مسلمان سیاست کے شجرِ ممنوعہ کے نزدیک نہ جائیں۔ اس پر کچھ مسلمانوں نے لبیک کہا، بعض نے تامل سے کام لیا اور قوم کو دینی مدارس و مراکز کی طرف دعوت دی، جس سے مسلمانوں میں تحریکِ عمل پیدا ہوئی۔

اس طرح انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش کا دور تھا اور ہر قدم پر انھیں ایک نئے امتحان اور آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

اس زمانے میں ہندو مسلمانوں سے تعلیم اور سیاست میں بہت آگے تھا۔ وہ انگریز کا سہارا لے کر ترقی کے میدان کو بڑی سرعت سے طے کر رہا تھا۔ تعلیم نے اسے یورپ کے نظریۂ وطنیت سے آشنا کیا۔ ہندو نے وطن کے نام پر ملک میں بیداری پیدا کی۔ اس دعوت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ سب اس طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ علامہ اقبال پر بھی اس سحرِ دعوت کا اثر ہوا، ان کی شاعری کا ابتدائی دور وطنیت کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔

وطن پروری سے بڑھ کر جو جذبات علامہ اقبال کو اس دور کا ہیرو بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس راگ کو اتنے جوش کے ساتھ الاپا کہ برطانوی قصرِ ملوکیت کے در و دیوار اس سے گونج اٹھے۔ یہ کام بڑے دل گردے کا تھا۔ کیونکہ بیسویں صدی کے آغاز میں آزادی کا نعرہ بلند کرنا حکمران قوم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے مترادف تھا۔ غلامی دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ حکومت کا رعب ہر کس و ناکس کو لرزہ براندام رکھتا تھا۔ ہر شخص ظاہری آسائشوں پر دل و جان سے فدا تھا۔ برطانیہ کے سایۂ ابد پایہ کے لیے مسجدوں،

مندروں، گرجوں اور شوالوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں ۔ آزادی کے طالب ملک و ملت کے دشمن سمجھے جاتے ۔ انھیں سانپوں اور بھیڑیوں سے زیادہ مہلک خیال کیا جاتا ۔ ہر طرف سے اس آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ۔ علامہ نے اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا :

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

پھر ایک مقام پر واضح طور پر فرماتے ہیں :

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

اقبال کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ ان ناسازگار حالات میں بالکل تن تنہا تھا ۔ اس نے اس بات کی قطعاً پروا نہ کی کہ وہ اکیلا اس پُرخطر راہ پر گامزن ہے ۔ دوسری قوموں اور ملکوں کی جنگِ آزادی کے حالات پر نظر ڈالیے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ اکثر زعمائے حُریت و استقلال نے اپنی آواز اس وقت بلند کی جب انھوں نے دیکھا کہ ملک کا بڑا طبقہ اس مقصد کے لیے آمادہ و تیار ہے ۔ روسو، والٹیر وغیرہ نے اس وقت نعرۂ حریت بلند کیا، جب انھیں اس بات کا یقینِ کامل ہو گیا کہ اہلِ فرانس کے دل میں آزادی کے لیے تڑپ موجود ہے اور وہ ان کے الفاظ بہرے کانوں سے نہ سنیں گے ۔ اٹلی میں میزینی اور گیری بالڈی نے ابنائے وطن میں آزادی کی لہر دوڑتے ہوئے دیکھی اور انھیں قربانی کے لیے تیار پایا تو آزادی کی شاہراہ پر قدم رکھا ۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے ملک کی قیادت ہاتھ میں لی جب ملک ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لیے تیار ہو چکا تھا، مگر یہاں حالات بالکل دگرگوں تھے ۔ چند انسان ہوں گے جو دل میں آزادیٔ وطن کے لیے تڑپ رکھتے ہوں ۔ کسی کے لیے چشمِ براہ ہوں، جو انھیں آزادی کی راہ پر لے چلے اور ان کے جذبات کی ترجمانی کرے ۔ ان کے دلوں کو تقویت دے اور حصولِ آزادی کے لیے ان کی راہ نمائی کرے ۔

اقبال نے پیغمبرانہ عزم کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا، اس نے اپنے وطن پرورانہ نغموں سے اہلِ وطن کے دل گرمائے، ان کی غفلت پر انھیں سرزنش کی، اس وادیٔ پُرخار کے خطرات سے

انھیں آگاہ کیا، ان کی کمزوریوں پر انھیں توجہ دلائی اور وطن کی خستہ حالی پر آنسو بہائے :

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

انھی ایام میں انھوں نے ترانۂ ہندی لکھا جس نے ملک کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔ حضرت علامہ کے بارے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انھوں نے کبھی وطن کی پرستش نہیں کی۔ وہ وطن پسند اور وطن پرور ضرور تھے۔ اس کا سراغ ان کے کلام میں بخوبی ملتا ہے۔ جن ایام میں انھوں نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا، ان ایام میں وہ ہندوستان کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے۔ چنانچہ جاوید نامہ کے یہ شعر ملاحظہ ہوں :

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد
پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نارِ او نورِ لازوال
در دو چشمِ او سرورِ لایزال
حلقۂ در بر سبکتر از سحاب
تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند
برلبِ او نالہ ہائے دردمند

اقبال ہندوستان کی آزادی چاہتا تھا، لیکن وہ اسے پسند نہ کرتا تھا کہ یہ ملک بھی بعد میں استعمار پسندانہ عزائم کا شکار ہو جائے، کیونکہ وطنیت کا تصور جو یورپ پیش کرتا ہے اس سے تنگ دلی اور تنگ نظری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اقبال ۱۹۰۵ء کے آخر میں تکمیلِ تعلیم کے لیے یورپ گئے اور وہاں ۱۹۰۸ء تک قیام پذیر رہے۔ اس مدت میں انھوں نے یورپ کی تہذیب کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ حیات رواں دواں ہے۔ زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور سعیِ پیہم کا نام ہے اور وطنیت جس پر اقوامِ مشرق مفتون ہیں وہ نہایت مہیب اور ہولناک شے ہے، جو تمام دنیا کا امن وامان ایک آن میں جلا کر راکھ کر دے گی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اپنے جوانوں میں جس حُبّ الوطنی اور قومی جذبے کو پیدا کر رہے ہیں وہ عنقریب تمام یورپ کو تباہی کے گہرے کنوئیں میں دھکیل دے گا اور دنیا پر ایسی تباہی لائے گا کہ دنیا میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی علامہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ یورپ عالمِ اسلام کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے اور وہ اس مقصد کے لیے نہایت خطرناک منصوبے تیار کر رہا ہے۔ ان حالات سے اقبال کے خیالات اور نظریات میں ایک انقلاب آفرین تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب وہ، وہ پہلا سا قومی شاعر نہ تھا۔ اس کے دل میں اگر ہندوستان کا درد تھا تو وہ عالمِ اسلام کے اتحاد کا داعی بھی تھا۔ چنانچہ وہ شیخ عبدالقادر کے نام پیغام میں کہتا ہے:

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دے

اسی طرح وہ ایک غزل میں جو ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی، یورپ کے مفسدانہ خیالات پر تبصرہ کرتا ہوا کہتا ہے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یورپ سے واپس آتے ہوئے ان کی نسلی پر نظر پڑی تو اس کا درد انگیز مرثیہ لکھا :

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، برطانیہ نے ترکی فوجوں پر مصر کا راستہ بند کر دیا، علامہ اس جنگ سے بے حد متاثر ہوئے اور اپنے جذبات آتشیں کو ایک درد انگیز نظم کی صورت میں پیش کیا۔ جب انھوں نے یہ نظم بادشاہی مسجد میں سنائی تو حاضرین تڑپ اُٹھے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو :

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس نظم نے مسلمانانِ ہند کے بیرونی دنیا کے مسلمانوں سے تعلقات استوار کرنے میں بڑا کام کیا۔ اسی جنگ کے سلسلے میں انھوں نے فاطمہ بنت عبداللہ پر نظم لکھی جو طرابلس کے جہاد میں زخمیوں کو پانی پلاتی ہوئی اطالوی گولیوں کا شکار ہوگئی تھی۔

یہ علامہ کا دوسرا کارنامہ ہے جس کی بدولت مسلمان وطنیت سے آزاد ہوئے۔ اسلام کا ہمہ گیری اخوت و مساوات کا سبق جو ہندی مسلمان اپنی غلامی کے باعث بھول چکے تھے، انھوں نے اسے پھر سے یاد دلایا۔ کاشغر سے لے کر مراکش تک کے مسلمانوں کو ایک کرنے کی کوشش کی اور انھیں اسلام کا پیغام سنایا اور اسلام کے نام پر جمع کر کے یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے بند باندھنے کی کوشش کی۔ مگر علامہ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ جو اسے ہمارے ہیروز کی صفِ اول میں جگہ دیتا ہے وہ نظریۂ پاکستان ہے، جو اس وقت حقیقت بن کر دنیا کے نقشے پر موجود ہے :

ہندوستان میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں تھے، لیکن ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ علم، تجارت، دولت اور سیاسی اثر و نفوذ کی وجہ سے مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ سب سے بڑی جماعت جو اس بات کی مدعی تھی کہ وہ ہندوستان میں بسنے والی قوموں کی مشترکہ جماعت ہے، آل

نڈیا کانگرس تھی۔ یہ سب سے قدیم سیاسی جماعت تھی۔ اس پر شروع ہی سے ہندو غالب رہے ہیں، گو معدودے چند مسلمان بھی اس سے وابستہ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنا الگ پلیٹ فارم مسلم لیگ قائم کیا۔ انھوں نے میثاقِ لکھنؤ کے نام سے آپس میں ایک پیکٹ بھی کیا، مگر یہ زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ خلافت کمیٹی نے عوام کو بیدار کیا۔ کانگرس کے غیر مسلم لیڈروں نے خلافت کی تحریک میں حصہ لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ہندو مسلم اتحاد کا خوابِ پریشاں شرمندۂ تعبیر بھی ہوگیا۔ مگر شدھی اور سنگھٹن کی تحریک سے اتحاد کا رشتہ پارہ پارہ ہوگیا اور ایک مرتبہ پھر ہندوستان فرقہ ورانہ نعروں سے گونج اٹھا۔ جا بجا ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔ دونوں قومیں آپس میں دست و گریباں ہوگئیں۔ ہندوستان کی سیاسی فضا اتنی بگڑ گئی کہ اس سے پیشتر کبھی یہ حالت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اتحاد کے لیے بڑی کوشش ہوئی مگر بے سود۔ اسی اثنا میں نہرو رپورٹ منصۂ شہود پر آئی، جس کی بدولت حالات خراب سے خراب تر ہو گئے۔ سمجھ دار مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ ہندو مسلم مسئلے کا حل کانگریس کے پاس نہیں اور نہ وہ اس کا کوئی حل تلاش کرنا چاہتی ہے۔ اس مایوسی کے عالم میں مسلمانوں میں ایک ٹولی ایسی بھی پیدا ہوئی جو محض وزارتوں کی خاطر ہندوؤں سے مل کر کام کرنے لگی۔ پنجاب میں اس پارٹی نے یونینسٹ کا لیبل اختیار کیا۔ اس پارٹی کی بدولت سکھ منظم ہوئے اور ان کا گوردواروں پر قبضہ ہوگیا اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سکھوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس دلایا گیا کہ وہ بھی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں اور پنجاب میں کوئی مسئلہ ان کی شرکت کے بغیر طے نہیں ہوسکتا، ان کو تناسبِ آبادی سے بڑھ کر جس قدر نمائندگی پنجاب اسمبلی میں دی گئی وہ مسلمانوں کی نیابت سے کاٹ کر دی گئی تھی۔ اس کی بدولت مسلمان اس صوبے میں اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اقلیت میں تبدیل کر دیے گئے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں الہ آباد کے مقام پر دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ علامہ اقبال اس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر ایک انقلاب انگیز خطبہ دیا، جس نے ہندوستان کی قسمت کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی جو کشتی ایک مدت سے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی ساحلِ مراد سے جا لگی۔ علامہ نے لیگ کے نصب العین کی وضاحت کی اور صاف صاف لفظوں میں ایک اسلامی مملکت کا اعلان کیا۔ انھوں نے فرمایا :

"ہمیں ایسی حکومت چاہیے جس کی زبان، جس کا رہن سہن اور جس کی قومیت ایک ہو۔ ہندوستان میں بہت سے فرقے بستے ہیں۔ ان سب کی زبانیں، لباس، رہنے سہنے کے طریقے الگ الگ ہیں مسلمانوں کا اپنا رہن سہن، اپنی پرانی تہذیب کے ساتھ سب سے الگ اور سب سے زیادہ مضبوط ہے، جسے ہم کسی طرح بھی کمزور یا اس میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے اپنی حکومت ہندوستان میں اپنے مذہب کی اچھی اور سچی باتوں کو بھلا کر کھوئی ہے، اب ہم پھر ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ اب تک کانگرس، انگریزی حکومت اور ان کی طرف دار سائمن کمیٹی یا دوسری اور کمیٹیوں نے جو تجویزیں بنائی اور بگاڑی ہیں، ان کا نتیجہ ہمارے خلاف ظاہر تھا، اس لیے ہم نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان سب باتوں اور چال بازیوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنا ایک الگ علاقہ چاہیے اور اس میں وہ صوبے ملا کر ہمیں اختیار دیا جائے جہاں مسلمانوں کی زیادہ آبادی ہے۔ اس اسلامی ہند میں ہم اپنی شان کی حکومت قائم کریں اور امن چین سے رہیں گے اور دوسرے فرقے کو اپنے علاقوں میں ایک الگ حکومت قائم کرنے کا حق ہو۔"

علامہ اقبال نے علیحدہ اسلامی ہند کا نظریہ پیش کر کے مسلمانوں کی صحیح منزل متعین کی۔ کسی نے اس تجویز کا مضحکہ اڑایا، کسی نے اسے شاعرانہ تخیل سے تعبیر کیا، اغیار نے بھی اس کی مخالفت کی اور انھوں نے بھی دبی زبان سے اس پر اعتراضات کیے، مگر اس اسکیم کی جس قدر مخالفت ہوئی، اسی قدر اسے عوام میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔

ان ایام میں مسلم لیگ ایک محدود طبقے کی جماعت تھی، عوام کو اس کی مجالس میں بہت کم باریابی حاصل تھی۔ اقبال اسے محسوس کرتے تھے، مگر مخصوص طبقہ جو اس پر قابض تھا وہ عوام کے لیے جگہ خالی کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جس کا انتظار تھا۔ جدوجہد کی نئی تنظیم ہونے لگی۔ یہ بڑا زریں موقع تھا کہ جدوجہد کو عوامی رنگ دیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ قائداعظم نے ان کی تجاویز پر لبیک کہا۔ علامہ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں انہی باتوں کا ذکر کیا۔ یہ خط قائداعظمؒ کے نام ہے:

"آپ کے جواب کا شکریہ۔ مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ میں نے مسلم لیگ کے دستور اور

پروگرام میں تغیر و تبدل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ کے پیشِ نظر ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ہندوستانی مسلمانوں کی نازک حالت کو بخوبی محسوس کرتے ہیں - لیگ کو ابھی اس بات کا تصفیہ کرنا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات ہی کی نمائندگی کرے گی یا تمام مسلمانوں کی جنھوں نے ابھی تک اس جانب اپنی توجہ اور دلچسپی کا رُخ نہیں کیا ہے - مجھے ذاتی طور پر اس کا یقین ہے کہ جو سیاسی تنظیم سارے مسلمانوں کے مفادات کا ذعدہ یا اقرار نہیں کر سکی، ان کو اپنے اندر جذب بھی نہیں کر سکی۔"

یہ انقلاب انگیز تجویز تھی - جب اسے تسلیم کر لیا تو لیگ میں ایک نئی روح جلوہ گر ہوئی، جس نے اسے بے پناہ قوت عطا کی اور اسے عوام کی قبولیت اور توجہ کا مرکز بنایا - اس طرح کانگرس کا بے پناہ پروپیگنڈا رابطۂ عوام (MASS CONTACT) بے اثر ہو کر رہ گیا اور مسلمانوں کو اپنے مقصد کے حصول میں اتنی شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ دنیا حیران ہو گئی اور یہ کامیابی بھی چند ہی برس کی کوشش کے بعد میسر آ گئی -

علامہ اقبالؒ ہمارے سب سے بڑے قومی ہیرو ہیں - وہ مفکر، شاعر اور فن کار بھی ہیں، ان کا ایک پیغام تھا، جسے انھوں نے ملتِ اسلامیہ تک پہنچایا اور ملت کو ایک نئی توانائی عطا کی - مردہ دلوں میں روحِ حیات پھونکی - اپنے خیالات کو ایک پیغام کی صورت میں ملت کے سامنے پیش کیا - ملت نے اسے سنا اور اس پر عمل کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کو جنم دیا اور جب تک یہ مملکت قائم ہے، اس وقت تک علامہ کا نام اس کے ساتھ ساتھ لیا جائے گا۔

الفہرست : محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتب فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علم نجوم، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیونکر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے، ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ قیمت ۴۵ روپے

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کے پیش کردہ اصولِ تاریخ صرف گزشتہ اقوام کے لیے ہی نہیں بلکہ موجودہ قوموں کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔

صفحات ۲۱۶ قیمت ۱۵ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور